عیدالفطر کس کے لیے؟

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عیدالفطر کی حقیقی اہمیت

اور نظامِ دین میں اس کی اہمیت

بعض حلقے یہ خیال بڑے زور شور سے پھیلا رہے ہیں کہ عید اسلامی اتحاد کا ایک اہم نشان ہے، اس لیے تمام مسلمانوں کی عید لازماً ایک دن ہونی چاہیے، ان میں سے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ساری دنیا کے مسلمانوں کی عید ایک دن ہو اور کچھ دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ پاکستان کے تمام مسلمانوں کی عید تو ایک ہی دن ہونی ضروری ہے، لیکن در حقیقت یہ فکر ونظر کی غلطی ہے۔ دین سے ناواقفیت کی بنا پر ایسی باتیں کی جارہی ہیں اور یہ باتیں زیادہ تر وہ لوگ کر رہے ہیں، جو رمضان کے روزے تو نہیں رکھتے، مگر عید کے معاملے میں اسلامی اتحاد کی انھیں بڑی فکر ہے۔

اِن حضرات کو پہلی غلط فہمی تو یہ لاحق ہے کہ عید ان کے نزدیک کرسمس، ہولی یا دیوالی کی طرح کوئی تہوار ہے۔ یا پھر یہ کوئی قومی جشن ہے، جسے مسلمانوں کے قومی اتحاد کا نشان بنایا گیا ہے۔ حالانکہ دراصل عید کا تعلق ایک عبادت سے ہے، جو رمضان کے آغاز سے شروع ہوتی ہے اور رمضان کے خاتمہ کے بعد اللہ تعالیٰ کے شکر کے طور پر دو رکعت نماز پڑھ کر ختم کی جاتی ہے۔ شریعت کے صریح احکام کی رو سے اِس عبادت کا آغاز اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک قابلِ اطمینان طریقہ سے یہ معلوم نہ ہو کہ رمضان شروع ہو چکا ہے۔

☆ یہ وہ تقریر ہے جو یکم شوال ۱۳۸۶ھ کو بروز جمعہ عید الفطر کے موقعے پر گلبرگ لاہور کے اجتماع میں کی گئی تھی۔

اور اس کا اختتام بھی اس وقت تک نہیں ہو سکتا، جب تک ایسے ہی قابل اطمینان طریقہ سے یہ علم نہ ہو جائے کہ رمضان ختم ہو چکا ہے۔ قرآن مجید کا صاف حکم ہے کہ

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ...فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ (البقرۃ:۱۸۵)

"رمضان کا مہینہ وہ ہے، جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے...پس تم میں سے جو شخص اس مہینے کو پائے (یا اس میں موجود ہو) وہ اس کے روزے رکھے۔"

یہ آیت قطعی طور پر اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ رمضان کا مہینہ جب سے شروع ہو اور جب تک وہ رہے، ہر مسلمان کو اس کے روزے رکھنے چاہئیں، اور اس مہینہ کے روزوں کی تکمیل کیے بغیر کسی عید کا ہرگز کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس معاملے میں اصل چیز مسلمانوں کا اتحاد نہیں ہے بلکہ ماہِ رمضان کا اختتام ہے، جس کا اطمینان حاصل کرنا عید کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ رمضان ایک قمری مہینہ ہے، جس کا انحصار رویتِ ہلال پر ہے اور اس کے بارے میں نبی ﷺ کی واضح ہدایت موجود ہے کہ چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر ہی روزے ختم کرو۔ لیکن اگر مطلع صاف نہ ہو تو تیس روزوں کی تعداد پوری کرو، الا یہ کہ دو قابل اعتماد گواہ یہ شہادت دیں کہ اُنھوں نے چاند دیکھا ہے۔ حضورؐ نے اس ارشاد میں دو باتیں صاف صاف متعین فرما دی ہیں۔ ایک یہ کہ رویت کی شہادت اس وقت درکار ہوگی جب کہ مطلع صاف نہ ہو، دوسرے یہ کہ اس صورت میں خبر پر نہیں بلکہ دو عادل گواہوں کی شہادت پر رویت کا فیصلہ کیا جائے گا اور شہادت کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ وہ تار، ٹیلیفون یا ریڈیو پر نہیں ہو سکتی اس کے لیے گواہوں کا سامنے موجود ہونا ضروری ہے۔ آپ کسی عدالت کو ٹیلیفون پر شہادت دے کر دیکھیں آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ یہ شہادت قابل قبول ہے یا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ جس ٹیلیفونی "شہادت" کو دنیا کی کوئی عدالت نہیں مان سکتی، آخر ہم سے کیوں چاہا جاتا ہے کہ ہم ایک ایسے اہم شرعی معاملہ میں اس پر اعتماد کر لیں، جس پر کروڑوں مسلمانوں کے روزے ٹوٹنے یا قائم رہنے کا انحصار ہے؟

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ساری دنیا کے مسلمانوں کی عید ایک دن ہونی چاہیے، وہ تو

بالکل ہی لغوبات کہتے ہیں۔ کیوں کہ تمام دنیا میں رویتِ ہلال کا لازماً اور ہمیشہ ایک ہی دن ہونا ممکن نہیں ہے۔ رہا کسی ملک یا کسی ایک بڑے علاقے میں سب مسلمانوں کی ایک عید ہونے کا مسئلہ تو شریعت نے اس کو بھی لازم نہیں کیا ہے۔ یہ اگر ہو سکے اور کسی ملک میں شرعی قواعد کے مطابق رویت کی شہادت اور اس کے اعلان کا انتظام کر دیا جائے تو اس کو اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے۔ مگر شریعت کا یہ مطالبہ ہرگز نہیں ہے کہ ضرور ایسا ہی ہونا چاہیے، اور نہ شریعت کی نگاہ میں یہ کوئی برائی ہے کہ مختلف علاقوں کی عید مختلف دنوں میں ہو۔

خدا کا دین تمام انسانوں کے لیے ہے اور ہر زمانے کے لیے ہے۔ آج آپ ریڈیو کی موجودگی کی بنا پر یہ باتیں کر رہے ہیں کہ سب کی عید ایک دن ہونی چاہیے، مگر آج سے ساٹھ ستر برس پہلے تک پورے برصغیر ہند تو درکنار، اس کے کسی ایک صوبے میں بھی یہ ممکن نہ تھا کہ ۲۹ رمضان کو عید کا چاند دیکھ لیے جانے کی اطلاع سب مسلمانوں تک پہنچ جاتی۔ اگر شریعت نے عید کی وحدت کو لازم کر دیا ہوتا تو پچھلی صدیوں میں مسلمان اس حکم پر آخر کیسے عمل کر سکتے تھے؟ پھر آج بھی اس کو لازم کر کے عید کی یہ وحدت قائم کرنا عملاً ممکن نہیں ہے۔ مسلمان صرف بڑے شہروں اور قصبوں ہی میں نہیں رہتے، دور دراز دیہات میں بھی رہتے ہیں اور بہت سے مسلمان جنگلوں اور پہاڑوں میں بھی مقیم ہیں۔ وحدتِ عید کو ایک لازمی شرعی حکم بنانے کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان ہونے کے لیے ملک میں صرف ایک ریڈیو اسٹیشن کا ہونا ہی ضروری نہ ہو، بلکہ ہر شخص کے پاس، یا ہر گھر کے لوگوں کے پاس یا مسلمانوں کی ہر چھوٹی سے چھوٹی بستی میں ایک ریڈیو سیٹ یا ایک ٹرانزسٹر بھی ضرور ہو، ورنہ وہ اپنے شرعی فرائض ادا نہ کر سکیں گے۔ کیا یہ آلات بھی اب دین کا ایک لازمی جز قرار پائیں گے؟ خدا کی شریعت نے تو ایسے قواعد مقرر کیے ہیں، جن سے ہر مسلمان کے لیے ہر حالت میں دینی فرائض ادا کرنا ممکن ہوتا ہے۔ اس نے نماز کے اوقات گھڑیوں کے حساب سے مقرر نہیں کیے کہ گھڑی ہر مسلمان کے لیے اس کے دین کا ایک جز بن جائے۔ بلکہ اس نے سورج کے طلوع وغروب اور زوال جیسے عالمگیر مناظر کو اوقاتِ نماز کی علامت قرار دیا، جنھیں

ہر شخص ہر جگہ دیکھ سکتا ہے۔

اِسی طرح اس نے روزے شروع اور ختم کرنے کے لیے بھی رمضان اور شوال کے چاند کی رویت کو علامت قرار دیا ہے، جو عالمگیر مشاہدے کی چیز ہے اور ہر مسلمان ہر جگہ چاند دیکھ کر معلوم کرسکتا ہے کہ اب رمضان شروع ہوا اور اب ختم ہوگیا۔ اگر وہ اس کی بنیاد جنتری کے حساب کو قرار دیتا تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہر مسلمان کے لیے یا تو فلکیات اور نجوم کا علم حاصل کرنا فرض ہو جاتا، یا جنتری اس کے دین کا ایک جز بن جاتی، جسے پاس رکھے بغیر وہ فرائضِ دینی ادا نہ کرسکتا۔ اور اگر وہ یہ حکم دیتا کہ ایک جگہ کی رویت سے ساری دنیا میں یا روئے زمین کی ایک ایک اقلیم میں روزے شروع اور ختم کرنا فرض ہے تو خبر رسانی کے موجودہ ذرائع کی ایجاد سے پہلے تو مسلمان اِس دین پر عمل کر ہی نہیں سکتے تھے، رہا ان کی ایجاد کے بعد کا دور تو اس میں بھی مسلمانوں پر یہ مصیبت نازل ہوجاتی کہ چاہے انھیں روٹی اور کپڑا میسر ہو یا نہ ہو، مگر وہ مسلمان رہنا چاہیں تو اُن کے پاس ایک ٹرانزسٹر ضرور ہو۔

عید کی مبارک باد کے حقیقی مستحق کون ہیں؟

حضرات! اس مسئلے کی ضروری توضیح کے بعد اب میں آپ کو اور اپنے تمام مسلمان بھائیوں کو عید کی مبارک باد دیتا ہوں۔ عید کی مبارک باد کے حقیقی مستحق وہ لوگ ہیں، جنھوں نے رمضان المبارک میں روزے رکھے قرآن مجید کی ہدایت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی فکر کی، اس کو پڑھا، سمجھا، اس سے رہ نمائی حاصل کرنے کی کوشش کی اور تقویٰ کی اُس تربیت کا فائدہ اٹھایا جو رمضان المبارک ایک مؤمن کو دیتا ہے۔ قرآن مجید میں رمضان کے روزوں کی دو ہی مصلحتیں بیان کی گئی ہیں، ایک یہ کہ ان سے مسلمانوں میں تقویٰ پیدا ہو:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۝ (البقرۃ: ۱۸۳)

”تم پر روزے فرض کیے گئے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو۔“

دوسرے یہ کہ مسلمان اس نعمت کا شکر ادا کریں، جو اللہ تعالیٰ نے رمضان میں قرآن مجید نازل کر کے ان کو عطا کی ہے:

لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدَاكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

”تاکہ تم اللہ کی بڑائی کرو اس بات پر کہ اس نے تمھیں ہدایت بخشی اور تاکہ تم شکر ادا کرو۔“

دنیا میں اللہ جل شانہٗ کی سب سے بڑی نعمت نوعِ انسانی پر اگر کوئی ہے تو وہ قرآنِ مجید کو نازل کرنا ہے۔ تمام نعمتوں سے بڑھ کر یہ نعمت ہے، اس لیے کہ رزق اور اس کے جتنے ذرائع ہیں، مثلاً یہ ہوا یہ پانی اور یہ غلے اور اسی طرح معیشت کے جو ذرائع ہیں، جن سے انسان اپنے لیے روزی کماتا ہے، مکان بناتا ہے ـــــ کپڑے فراہم کرتا ہے، یہ ساری چیزیں بھی اگرچہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور احسان ہی ہیں، لیکن یہ فضل و احسان اور اللہ تعالیٰ کی یہ نعمتیں محض انسان کے جسم کے لیے ہیں۔ قرآن مجید وہ نعمت ہے جو انسان کی روح کے لیے، اس کے اخلاق کے لیے اور درحقیقت اس کی اصل انسانیت کے لیے نعمتِ عظمٰی ہے۔ ایک مسلمان اللہ تعالیٰ کا شکر اسی صورت میں صحیح طور پر بجا لاسکتا ہے، جب کہ وہ اس کے دیے ہوئے رزق پر بھی شکر ادا کرے، اور اس کی دی ہوئی اس نعمتِ ہدایت کے لیے بھی شکر ادا کرے، جو قرآن کی شکل میں اُس کو دی گئی ہے۔ اس کا شکر ادا کرنے کی یہ صورت نہیں ہے کہ آپ بس زبان سے شکر ادا کریں۔ اور کہیں کہ اللہ تیرا شکر کہ تو نے قرآن ہمیں دیا، بلکہ اس کے شکر کی صحیح صورت یہ ہے کہ آپ قرآن کو سرچشمۂ ہدایت سمجھیں، دل سے اس کو رہنمائی کا اصل مرجع مانیں اور عملاً اس کی رہنمائی کا فائدہ اٹھائیں۔

قرآن مجید آپ کو اپنی ذاتی زندگی کے متعلق ہدایت کرتا ہے کہ آپ کس طرح سے ایک پاکیزہ زندگی بسر کریں۔ وہ آپ کو ان چیزوں سے منع کرتا ہے، جو آپ کی شخصیت کے نشوونما کے لیے نقصان دہ ہیں۔ وہ آپ کو وہ چیزیں بتاتا ہے، جن پر آپ عمل کریں تو آپ کی شخصیت صحیح طور پر نشوونما پائے گی، اور آپ ایک اچھے انسان بن سکیں گے۔ وہ آپ کی اجتماعی زندگی کے متعلق بھی مفصل ہدایات آپ کو دیتا ہے۔ آپ کی

معاشرتی زندگی کیسی ہو۔ آپ کے گھر کی زندگی کیسی ہو۔ آپ کے تمدن اور آپ کی تہذیب کا نقشہ کیا ہو۔ آپ کی ریاست کن طریقوں پر چلے۔ آپ کا قانون کیا ہو۔ آپ کی معاشرتی زندگی کا نظام کیسا ہو۔ کن طریقوں سے آپ اپنی روزی حاصل کریں۔ کن راہوں میں آپ اپنی کمائی ہوئی دولت کو خرچ کریں، اور کن راہوں میں نہ کریں۔ آپ کا تعلق اپنے خدا کے ساتھ کیسا ہو، آپ کا تعلق خود اپنے نفس کے ساتھ کیسا ہو، آپ کا تعلق خدا کے بندوں کے ساتھ کیسا ہو، اپنی بیوی کے ساتھ، اپنی اولاد کے ساتھ، اپنے والدین کے ساتھ، اپنے رشتے داروں کے ساتھ، اپنے معاشرے کے افراد کے ساتھ اور دنیا کے تمام انسانوں کے ساتھ، حتیٰ کہ جمادات اور حیوانات کے ساتھ اور خدا کی دی ہوئی تمام مختلف نعمتوں کے ساتھ آپ کا برتاؤ کیسا ہونا چاہیے۔ زندگی کے ان سارے معاملات کے لیے قرآن مجید آپ کو واضح ہدایات دیتا ہے۔ ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ اس کو اصل سرچشمۂ ہدایت مانے، رہ نمائی کے لیے اسی کی طرف رجوع کرے، ان احکامات و ہدایات اور اُن اصولوں کو صحیح تسلیم کرے جو وہ دے رہا ہے، اور ان کے خلاف جو چیز بھی ہو، اس کو رد کردے، خواہ وہ کہیں سے آرہی ہو۔ اگر کسی شخص نے اس رمضان المبارک کے زمانے میں قرآن کو اس نظر سے دیکھا اور سمجھا ہے۔ اور کوشش کی ہے کہ اس کی تعلیم و ہدایت کو زیادہ سے زیادہ اپنی سیرت و کردار میں جذب کرے، تو اس نے واقعی اس نعمت پر اللہ کا صحیح شکر ادا کیا ہے۔ وہ حقیقت میں اس پر مبارک باد کا مستحق ہے کہ رمضان المبارک کا ایک حق جو اس پر تھا، اسے اس نے ٹھیک ٹھیک ادا کردیا۔

رمضان المبارک کے روزوں کا دوسرا مقصد جس کے لیے وہ آپ پر فرض کیے گئے ہیں، یہ ہے کہ آپ کے اندر تقویٰ پیدا ہو۔ آپ اگر روزے کی حقیقت پر غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تقویٰ پیدا کرنے کے لیے اس سے زیادہ کارگر ذریعہ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ تقویٰ کیا چیز ہے؟ تقویٰ یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچے اور اس کی فرماں برداری اختیار کرے۔ روزہ مسلسل ایک مہینے تک آپ کو اِسی چیز کی مشق کراتا ہے۔ جو چیزیں آپ کی زندگی میں عام طور پر حلال ہیں وہ بھی اللہ کے حکم سے روزے میں حرام ہو

جاتی ہیں، اور اس وقت تک حرام رہتی ہیں، جب تک اللہ ہی کے حکم سے وہ حلال نہ ہو جائیں۔ پانی جیسی چیز جو ہر حال میں حلال وطیب ہے، روزے میں جب اللہ حکم دیتا ہے کہ اب تمھارے لیے حرام ہے تو آپ اس کا ایک قطرہ تک حلق سے نہیں اُتار سکتے خواہ پیاس سے آپ کا حلق چٹخنے ہی کیوں نہ لگے، البتہ جب اللہ پینے کی اجازت دے دیتا ہے اس وقت آپ اس کی طرف اِس طرح لپکتے ہیں گویا کسی نے آپ کو باندھ رکھا تھا اور آپ ابھی کھولے گئے ہیں۔ ایک مہینے تک روزانہ یہ باندھنے اور کھولنے کا عمل اسی لیے کیا جاتا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی پوری پوری بندگی واطاعت کے لیے تیار ہو جائیں۔ جس جس چیز سے وہ آپ کو روکتا ہے اس سے رکنے کی اور جس جس چیز کا وہ آپ کو حکم دیتا ہے اس کو بجا لانے کی آپ کو عادت ہو جائے۔ آپ اپنے نفس پر اتنا قابو پالیں کہ وہ اپنے بے جا مطالبات اللہ کے قانون کے خلاف آپ سے نہ منوا سکے۔ یہ غرض ہے جس کے لیے روزے آپ پر فرض کیے گئے ہیں۔

اگر کسی شخص نے رمضان کے زمانے میں روزے کی اس کیفیت کو اپنے اندر جذب کیا ہے تو وہ حقیقت میں مبارک باد کا مستحق ہے۔ اور اس سے زیادہ مبارکباد کا مستحق وہ شخص ہے جو مہینہ بھر کی اس تربیت کے بعد عید کی پہلی ساعت ہی میں اسے اپنے اندر سے اُگل کر پھینک نہ دے بلکہ باقی گیارہ مہینے اس کے اثرات سے فائدہ اٹھاتا رہے۔ آپ غور کیجیے، اگر ایک شخص اچھی سے اچھی غذا کھائے جو انسان کے لیے نہایت قوت بخش ہو، مگر کھانے سے فارغ ہوتے ہی حلق میں اُنگلی ڈال کر اس کو فوراً اُگل دے تو اُس غذا کا کوئی فائدہ اُسے حاصل نہ ہوگا، کیوں کہ اس نے ہضم ہونے اور خون بنانے کا اسے کوئی موقع ہی نہ دیا۔ اس کے برعکس اگر ایک شخص غذا کھا کر اُسے ہضم کرے اور اس سے خون بن کر اس کے جسم میں دوڑے، تو یہ کھانے کا اصل فائدہ ہے جو اس نے حاصل کیا۔ کم درجے کی مقوی غذا کھا کر اُسے جزوِ بدن بنانا اس سے بہتر ہے کہ بہترین غذا کھانے کے بعد استفراغ کر دیا جائے۔ ایسا ہی معاملہ رمضان کے روزوں کا بھی ہے۔ ان کا حقیقی فائدہ آپ اِسی طرح اٹھا سکتے ہیں کہ ایک مہینے تک جو اخلاقی تربیت اِن روزوں نے آپ کو دی ہے، عید کے بعد

آپ اس کو نکال کر اپنے اندر سے پھینک نہ دیں، بلکہ باقی گیارہ مہینے اس کے اثرات کو اپنی زندگی میں کام کرنے کا موقع دیں۔ یہ فائدہ اگر کسی شخص نے اس رمضان سے حاصل کرلیا تو وہ واقعی پوری پوری مبارک باد کا مستحق ہے کہ اس نے اللہ کی ایک بہت بڑی نعمت پالی۔

شعائرِ دین کے ساتھ ہمارا معاملہ

ہمارے اندر بدقسمتی سے ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی موجود ہے، جو رمضان کے زمانے میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نہیں کرتے۔ رمضان آتا ہے اور گزر جاتا ہے مگر ان کے گھروں میں یہ محسوس تک نہیں ہوتا کہ یہاں کچھ مسلمان بستے ہیں، جن کے لیے یہ مہینہ کوئی خاص معنی رکھتا ہے۔ روزہ رکھنا تو درکنار، اس کا احترام کرنے کی توفیق بھی ان کو نصیب نہیں ہوتی۔ رمضان کے زمانے میں وہ اسی طرح اطمینان سے کھاتے اور پیتے رہتے ہیں جیسے کوئی عیسائی یا ہندو یا سکھ کھاتا پیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ یہ طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں، ان کی مثال اس بنجر زمین کی سی ہے، جس کے اندر بارش کا موسم آنے پر بھی، جب کہ ہر طرف سبزہ زار پھیلا ہوتا ہے اور کھیتیاں پھلتی اور پھولتی ہیں، گھاس کا ایک تنکا تک پیدا نہیں ہوتا۔ بارش کا زمانہ جس طرح زمین کے لیے روئیدگی کا موسم ہے، ٹھیک اسی طرح رمضان المبارک روحِ اسلام کے لیے بالیدگی کا موسم ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے روزے کا حکم اس شکل میں دیا ہوتا کہ مسلمانوں میں سے ہر شخص جب چاہے روزے رکھ کر تیس روزوں کی تعداد پوری کرلیا کرے تو ہماری دینی زندگی میں یہ موسم کی سی کیفیت کبھی پیدا نہ ہوسکتی تھی، لیکن اس حکیمِ مطلق نے حکم اس شکل میں دیا کہ تمام مسلمان ایک ہی مہینے میں ایک ساتھ روزے رکھیں۔ اِس چیز نے موسم کی سی کیفیت پیدا کردی۔ موسم جب آتا ہے تو اعلیٰ درجے کی زرخیز زمینوں کو چھوڑیے، جس زمین میں کچھ بھی روئیدگی کی صلاحیت ہوتی ہے، اس کے اندر سے بھی سبزی کی کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں کیوں کہ موسم کی برکت یہی ہے کہ روئیدگی کی ادنیٰ سے ادنیٰ صلاحیت رکھنے والی زمین بھی اس کے فیض سے محروم نہیں رہتی، اور جو زمین موسم آنے پر بھی ایک کونپل تک نہ نکالے اس کی یہ کیفیت اس بات کی صریح علامت ہوتی ہے کہ وہ قوتِ نمو سے بالکل خالی ہے۔ اِسی طرح رمضان ایک ایسا زمانہ ہے کہ جس مسلمان

کے اندر ایمان کی ایک رمق اور اسلام کا کوئی ذرّہ برابر جذبہ بھی موجود ہو وہ گیارہ مہینے خواہ کیسا ہی بے حس رہا ہو، اس مہینے کے آتے ہی اس کے اندر کا سویا ہوا ایمان کروٹیں لینے لگتا ہے۔ ایک مہینے تک تمام مسلمانوں کا بیک وقت سحری کے لیے اٹھنا، سب کا ایک ساتھ دن بھر روزے رکھنا، ایک ہی وقت میں سب کا افطار کرنا، اور راتوں کو جگہ جگہ تراویح پڑھنا، مسلمانوں کی بستیوں میں ایک زبردست اجتماعی ماحول پیدا کر دیتا ہے۔ جس کی برکت سے مسجدیں بھر جاتی ہیں، ہر طرف تلاوتِ قرآن کا چرچا ہونے لگتا ہے، وہ لوگ بھی نمازیں پڑھنے لگتے ہیں جو دوسرے دِنوں میں نماز کے پابند نہیں ہوتے، اور وہ لوگ بھی روزے رکھنے لگتے ہیں، جن کے اندر دوسرے دنوں میں دین سے کوئی خاص لگاؤ نہیں پایا جاتا۔ اِس ماحول میں بھی اگر کوئی شخص بالکل غیر متاثر رہتا ہے، خدا کی طرف کوئی رجوع اُس کے دل میں پیدا نہیں ہوتا۔ نماز روزے اور تلاوتِ قرآن کے لیے کوئی رغبت اُس کے دل میں نہیں ابھرتی، تو اس کے صاف معنی یہی ہیں کہ اس کا دل جذبۂ ایمانی سے قطعاً خالی ہے۔ اسلام سے اس کا کوئی رشتہ باقی نہیں رہا ہے۔ خدا اور اس کے دین کے ساتھ، اور مسلمانوں کی ملت کے ساتھ جتنے روابط ہو سکتے تھے، اُن سب کو اُس نے کاٹ پھینکا ہے۔ اِس کے بعد آپ کیا بھروسہ کر سکتے ہیں کہ جو آدمی مسلمانوں کے اندر پیدا ہو کر مسلمانوں کی ملت میں آنکھیں کھول کر مسلمان معاشرے کا ایک جزء ہو کر اس قوم کے دین اور اُس کے نظامِ حیات ہی سے اپنے مقدس ترین تعلقات اور روابط کو اس طرح کاٹ سکتا ہے، وہ کل اس قوم کے ساتھ کوئی غداری اور خیانت نہ کر بیٹھے گا۔ ظاہر بات ہے کہ وہ اپنی خواہشاتِ نفس کی بندگی ہی میں تو یہ طرزِ عمل اختیار کر رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب اس کی خواہشات اس سے یہ کچھ کرا سکتی ہیں تو کل یہی خواہشات اس سے اور کیا کچھ نہ کرا سکیں گی؟

حضرات! ہمیں بڑی سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیے کہ یہ صورتِ حال ہمارے ہاں آخر کیوں پیدا ہوئی ہے۔ اگر چند آدمی ہی اس میں مبتلا ہوتے ہیں تو اسے نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ مگر یہاں تو ہزاروں لاکھوں آدمی ہمارے اندر ایسے موجود ہیں جو علانیہ اور فخریہ رمضان میں کھاتے پیتے رہتے ہیں اور الٹا روزہ داروں کو شرمندہ کرتے ہیں۔ یہ فی الواقع

بڑی تشویش کی بات ہے اور ہمیں اس کے اسباب کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ صورتِ حال دراصل اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ ہم نے ایک مدت سے اس بات کی پروا کرنی چھوڑ دی ہے کہ ہمارے اندر جو اصلاحِ عظیم اللہ اور اس کے رسول اور اس کی کتاب نے کی تھی وہ ہمارے معاشرے میں باقی رہتی ہے یا ضائع ہو جاتی ہے۔ ہمیں اپنی قوم کی دنیا بنانے کی تو بڑی فکر رہی ہے اور اس کے لیے ہم بڑی تگ و دو کرتے رہے ہیں، مگر اس عظیم الشان اخلاقی و روحانی اصلاح اور اس زبردست دینی نظام کو برقرار رکھنے کی کوئی فکر ہمیں نہیں رہی، جس پر ہماری ملت کے معاشرے کو قائم کیا گیا تھا۔ بلکہ اس کے برعکس ہمارے ہاں بڑے پیمانے پر تعلیم و تربیت اور قانون و ضابطہ کا وہ نظام کارفرما رہا ہے، جو اس ڈھانچے کو منہدم کرنے والا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ اسلام کے عظیم ترین مقدسات کے پامال ہونے کی ہمارے بااثر طبقے اُتنی بھی پروا نہیں کرتے جتنی اپنی پتلون کی شکن خراب ہو جانے کی کرتے ہیں۔

اصلاح اور فساد

حضرات! انسان کی اصلاح ایک بڑا مشکل کام ہے، اس کو بگاڑنا کوئی مشکل کام نہیں ہے، اصلاح کرنی ہو تو سالہا سال کی محنتوں اور مسلسل کوششوں سے ہوتی ہے۔ بگاڑ ہونا ہو تو اس کے لیے کوئی خاص محنت و کوشش درکار نہیں ہوتی۔ بسا اوقات صرف سعیِ اصلاح سے غفلت ہی اس کے لیے کافی ہو جاتی ہے۔ آپ ایک بچے ہی کی مثال لے لیجیے۔ اس کو آپ ایک اچھا اور پاکیزہ انسان بنانا چاہیں تو آپ کو برسوں اپنی جان کھپانی پڑے گی تب کہیں اس کے ذہن اور عادات اور خصائل کو آپ سنوار سکیں گے۔ لیکن اگر آپ چاہیں کہ وہ بگڑے تو اس کے لیے کسی خاص کوشش کی حاجت نہیں ہے۔ صرف باگیں ڈھیلی چھوڑ دینا کافی ہے، معاشرے میں ہر طرح کے لچوں لفنگوں کے ساتھ چل پھر کر وہ خود بگڑ جائے گا۔ محنت اور کوشش کی ضرورت ترقی کے لیے ہوتی ہے نہ کہ تنزلی کے لیے۔ آپ کسی گاڑی کو بلندی پر لے جانا چاہیں تو بڑی طاقت صرف کیے بغیر وہ اوپر نہ چڑھ سکے گی۔ نشیب کی طرف جانا چاہیں تو صرف بریک ڈھیلا چھوڑ دیجیے۔ گاڑی خود لڑھکے گی اور جہاں تک نشیب ملے گا

لڑھکتی چلی جائے گی۔ ایسا ہی معاملہ انسانی معاشرے کا ہے۔ کسی معاشرے کو درست کر کے ایک اعلیٰ درجے کے نظامِ فکر و عمل کا پابند بنانا بڑا محنت طلب کام ہے، جس کے لیے صدیوں کی کوششیں درکار ہوتی ہیں، مگر ان کوششوں کے ثمرات و نتائج کو ضائع کرنے کے لیے صرف اتنی بات بھی کافی ہوسکتی ہے کہ آپ ان کو قائم و برقرار رکھنے کی کوشش چھوڑ دیں۔ اور جو بگاڑ بھی معاشرے میں پھیلتا نظر آئے اس کی پروانہ کریں۔ مسلمانوں میں جو خوبیاں پیدا ہوئیں وہ کچھ یونہی اتفاقاً نہیں پیدا ہوگئیں۔ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ اور اُن کے بعد امت کے صلحا و اتقیاء اور علماء و فقہاء نے صدیوں کی عرق ریزی و جاں فشانی سے کروڑوں انسانوں کو کفر و شرک کی تاریکیوں سے نکالا۔ اخلاق کی پستیوں سے اٹھایا۔ جاہلیت کی رسموں اور طور طریقوں کو مٹایا۔ خدائے واحد کی بندگی کے لیے اُن کو تیار کیا۔ آخرت کی باز پرس کا عقیدہ ان کے دلوں میں بٹھایا۔ اخلاقِ فاضلہ کی تعلیم و تربیت دے کر ایک خاص کیرکٹر ان کے اندر پیدا کیا۔ نماز، روزے، حج اور زکوٰۃ جیسی پاکیزہ عبادات ان میں رائج کیں، اور اسلامی نظامِ تہذیب و تمدن کا ایک مضبوط سانچا تیار کر دیا، جس کی بدولت مسلمان اُن خوبیوں سے آراستہ ہوئے جو دوسروں کے لیے قابلِ رشک تھیں۔ یہ جو کچھ صدہا برس کی محنتوں اور مسلسل کوششوں سے بنا ہے اس کو ہم ضائع اور برباد کرنا چاہیں تو آسانی سے کر سکتے ہیں لیکن اسے پھر تعمیر کرنا چاہیں تو پھر صدیاں ہی اس کے لیے درکار ہوں گی۔

یہ ہماری انتہائی بدقسمتی ہے کہ ہمارے اسلاف نے سینکڑوں برس کی محنتوں سے ہمارے اندر جو اصلاح کی تھی، اس کو ہم نے پچھلے ایک صدی کے اندر بری طرح ضائع کیا ہے۔ پہلے انگریزوں کی غلامی کے زمانے میں وہ بہت کچھ ضائع ہوئی۔ اور اب اُن کی غلامی ختم ہو جانے کے بعد خود اپنے حکمرانوں کے دور میں ہم اس کو پہلے سے بھی زیادہ ضائع کر رہے ہیں۔ یہ وہی غلطی ہے جس پر قرآن مجید میں متعدد مقامات پر متنبہ فرمایا گیا ہے کہ

لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (الاعراف:۵۶)

”زمین میں اصلاح ہو جانے کے بعد اس میں بگاڑ پیدا نہ کرو۔“

روئے زمین پر بسنے والے انسانوں کی زندگی میں جتنی بھی اصلاح ہوئی ہے

انبیاء علیہم السلام اور نوعِ انسانی کے نیک انسانوں کی ہزار ہا برس کی کوششوں سے ہوئی ہے۔ ایک ایک برائی کا سد باب کرنے اور ایک ایک بھلائی کو قائم کرنے میں خدا کے صالح بندوں کو صد ہا برس محنت کرنی پڑی ہے۔ تب جا کر دنیا میں کچھ عالمگیر اخلاقی ضوابط پر انسانی تہذیب کی تعمیر ہو سکی ہے۔ اس تعمیر کو برباد تو آسانی سے کیا جا سکتا ہے، مگر پھر سے اس کو تعمیر کر دینا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ ایک معمولی مثال دیکھیے۔ صرف یہ بات کہ عورت اور مرد کا تعلق نکاح کے سوا کسی اور صورت میں نہ ہو، انسان کو اس کا قائل کرنا اور اس کا خوگر بنانا اور معاشرے میں اس کو ایک مسلّم ضابطے کی حیثیت سے رائج کر دینا اتنا مشکل کام تھا کہ انبیاء علیہم السلام اور صالحینِ نوعِ انسانی کو اس کے لیے ہزار ہا برس تک کوشش کرنی پڑی ہوگی، تب کہیں دنیا میں یہ ایک اصلاح نافذ کی جا سکی ہوگی۔ اس لیے کہ انسان میں جنسی انارکی کی طرف ایسا زبردست میلان موجود ہے کہ اسے ایک اخلاقی ضابطہ کا پابند بنا دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اِس اصلاح کو ضائع کر دینے کے لیے کسی بڑی محنت کی ضرورت نہیں۔ عورتوں اور مردوں میں آزادانہ اختلاط کی راہیں کھول دیجیے، اور خاندانی منصوبہ بندی کے ذرائع و وسائل عام لوگوں کی دسترس تک پہنچا دیجیے، جنسی انارکی کا دیو جسے مشکل سے باندھا گیا تھا، ایک دفعہ کھل جانے کے بعد دیکھتے دیکھتے اس ساری اصلاح کو غارت کر دے گا، جو ہزار ہا برس کی کوششوں سے ہوئی تھی۔ لیکن اس کے تباہ کن نتائج سامنے آنے کے بعد، جس طرح کہ آج وہ مغربی معاشرے کے سامنے انتہائی بھیانک صورت میں آ رہے ہیں، آپ اگر چاہیں کہ پھر اس دیو کو قید کر دیں تو یہ کوئی آسان کام نہ ہوگا۔ اس کے لیے پھر صد ہا برس ہی کی محنتیں درکار ہوں گی۔ اسی لیے قرآن مجید انسانیت کے غارت گروں کو متنبہ کرتا ہے کہ زمین میں جو اصلاح بڑی مشکلوں سے ہوئی ہے اس کو تم اپنی حماقتوں سے برباد نہ کرو۔

اِسی ایک مثال پر آپ قیاس کر لیجیے کہ جس عظیم الشان عمارت کا نام اسلامی تہذیب و تمدن ہے، اس کی تعمیر کس مشکل سے ہوئی ہوگی۔ کتنی جہالتوں اور گمراہیوں کو مٹا کر اور کتنی برائیوں کا سد باب کر کے اس کے لیے زمین صاف کی گئی ہوگی۔ کتنی جاں فشانیوں

سے صحیح عقائد اور صحیح خیالات ذہنوں میں بٹھائے گئے ہوں گے۔ کیا کچھ محنتیں اخلاقی حدود اور ضوابط کو معاشرے میں عملاً قائم کرنے پر صرف کی گئی ہوں گی اور پھر اس پوری عمارت کو سہارنے کے لیے اسلامی نظامِ زندگی کے یہ پانچ ستون ــــ شہادت، توحید، نماز، روزہ اور حج ــــ مضبوطی کے ساتھ جمائے گئے ہوں گے۔ یہ جو کچھ بنا ہے، ہمارے اسلاف کی بے حد وحساب کوششوں سے بنا ہے، اور یہ عظیم سرمایہ ہمیں میراث میں مفت مل گیا ہے، اس کو اگر ہم ترقی نہیں دے سکتے تو کم از کم اِسے برباد تو نہ کرنا چاہیے۔ ہمارا نظام تعلیم و تربیت، ہمارا لٹریچر، ہمارا تصورِ ثقافت، اور بحیثیت مجموعی ہمارے قوانین اور نظم و نسق اور معیشت و معاشرت کا پورا نظام جس رفتار سے اس سرمائے کی ناقدری کرنے والے اور اس کو برباد کرنے والے لوگ روز بروز زیادہ سے زیادہ تعداد میں پیدا کر رہا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے کچھ بعید نہیں کہ ایک روز ہم اس کو بالکل کھو دیں گے، اور اگر ایک دفعہ ہم نے اسے کھو دیا تو پھر اسے ازسرِ نو حاصل کر لینا کوئی آسان کام نہ ہوگا۔ خدا نہ کرے کہ وہ وقت آئے، اور خدا کرے کہ اُس کے آنے سے پہلے ہی ہم سنبھل جائیں۔

꧁꧂